بحث ونظر

اسلامی ممالک کی اقتصادی پسماندگی

(اسباب وعلل)

پروفیسر اوصاف احمد

۱۔ تمہید

ہم عصر دنیا میں اسلامی ممالک ایک پیچیدہ اور متنوع گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں تقریباً ۶۳ کروڑ لوگ آباد ہیں جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ گو کہ ان ممالک میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں لیکن تنوع غالباً ان کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ اسلامی ممالک کی ۸۰ فیصد آبادی گیارہ مسلم ممالک میں آباد ہے۔ ان میں سے بھی تقریباً تین چوتھائی (یا ۷۴ فیصد) ان آٹھ ملکوں میں پائی جاتی ہے جن کی کل آبادی ۲ کروڑ یا اس سے زیادہ ہے۔ اسلامی ملکوں میں ایسے ملک بھی ہیں جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ گھنی آبادی والے علاقے ہیں (مثلاً بحرین، بنگلہ دیش، اور مالدیپ) اور ایسے بھی جہاں فی مربع کلومیٹر آبادی دنیا میں سب سے کم ہے (مثلاً لیبیا، موریطانیہ، نائیجر، اور عمان)۔ رقبہ کے اعتبار سے اسلامی ممالک میں بحرین، مکوروس، اور قطر جیسے ننھے منے ممالک بھی شامل ہیں اور سعودی عرب اور سوڈان جیسے بڑے ممالک بھی جن کا رقبہ ۲۰ لاکھ مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے، فی کس قومی آمدنی کے اعتبار سے اسلامی ممالک کے تنوع کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی صفوں میں دنیا کے امیر ترین ممالک (کویت، سعودی عرب) سے لے کر دنیا کے غریب ترین ممالک (بنگلہ دیش، سوڈان، صومالیہ) موجود ہیں۔

ان کے علاوہ، اسلامی ممالک میں قدرتی وسائل، آب وہوا، محنت کشوں کی تعداد،

سرمایہ کی فراہمی، نیز سماجی و معاشی ترقی کی عام سطح کے اعتبار سے بھی فرق پایا جاتا ہے۔ اس مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم اسلامی ممالک میں اقتصادی ترقی اور پسماندگی کا ایک سرسری جائزہ لیں، اور جہاں تک ممکن ہو ان کی اقتصادی پسماندگی کے اسباب کی نشان دہی کریں۔ تاہم اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی ممالک کی اقتصادی اعتبار سے کوئی درجہ بندی کی جائے۔ تاکہ تجزیہ و تحلیل میں آسانی ہو سکے۔ ورنہ پچاس ملکوں کے ایک مجموعہ کے بارے میں، جس میں ہر طرح کے ملکوں کی نمائندگی ہو، کوئی معنی خیز بات کہنا علمی اعتبار سے مشکل ہوگا۔

جہاں تک ملکوں کی درجہ بندی کا سوال ہے، وہ کئی متبادل بنیادوں پر کی جا سکتی ہے۔ مثلاً جغرافیائی محل وقوع، قرب مکانی، معاشی اور معاشرتی تنظیم کی یکسانیت، ترقی کی سطح، نوعِ معیشت وغیرہ۔ ان میں سے کس بنیاد کو منتخب کیا جائے اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ درجہ بندی کا استعمال کس مقصد کے لیے کیا جانا ہے۔

معاشی ترقی کے امکانات اور مضمرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے اسلامی ممالک کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے: تیل برآمد کرنے والے ممالک، غریب ترین ممالک، اور نسبتاً ترقی یافتہ ممالک۔ فی کس قومی آمدنی، شرح خواندگی، اور کل قومی پیداوار میں صنعتی زمرہ کے حصہ کی بنیاد پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۳۶ ایسے ممالک کی نشاندہی کی ہے جن میں معاشی ترقی کی سطح سب سے کم ہے۔ ان ممالک کو "کم سے کم ترقی یافتہ ممالک" (least developed countries) یا غریب ترین ممالک کہا جاتا ہے ان ۳۶ ممالک میں سے ۱۸ ممالک اسلامی ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہم نے ان ملکوں کو "غریب ترین مسلم ممالک" کے گروہ میں رکھا ہے۔ جہاں تک تیل برآمد کرنے والے ممالک کا تعلق ہے اس گروہ میں شامل ملکوں میں کئی خصوصیات مشترک ہیں۔ ان کی قومی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تیل کی برآمد ہے۔ ان کی معیشت پر برآمدی زمرہ (export sector) حاوی ہے اس کے علاوہ گزشتہ ۲۰ برسوں میں بین الاقوامی بازار میں تیل کی اونچی قیمتوں کے باعث ان ملکوں میں غیر ملکی زرمبادلہ کی ایک بڑی مقدار جمع ہو گئی ہے۔ جس کے باعث ان ملکوں کا شمار دنیا کے امیر ترین ممالک میں ہونے لگا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ان ملکوں کو بھی ایک مختلف گروہ

کی صورت میں دیکھا جائے۔ بقیہ ممالک کو ہماری درجہ بندی کے لحاظ سے ایک تیسرے گروہ میں رکھا گیا ہے۔ ان ملکوں کی معاشی سطح، غریب ترین ممالک' اور تیل برآمدی ممالک کے درمیان میں ہے۔ ان میں سے بعض ملک توزرعی اور صنعتی ترقی کے اعتبار سے غریب ترین ممالک سے کہیں آگے ہیں لیکن خوش حالی' اور فی کس قومی آمدنی کی اس سطح کو نہیں پہونچتے جو تیل برآمدی ممالک میں عام ہے۔ فی الحقیقت اس تیسرے گروہ میں مزید تفریق ممکن ہے مثلاً ان ممالک کو، زرعی اور صنعتی ممالک، یا کسی اور مناسب بنیاد پر درجہ بند کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس گروہ کی تعداد کو کم رکھنا بھی مقصود ہے تاکہ تجزیہ مناسب طریقے پر ہو سکے، اس لیے ہم نے اس درجہ بندی، کو ان تین بنیادی گروہوں تک ہی محدود رکھا ہے۔

۲۔ مختلف گروہوں کی معاشی خصوصیات

اسلامی ممالک کے ان تینوں گروہوں کی معاشی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

ا۔ تیل برآمد کرنے والے ممالک:۔

اس گروہ میں شامل ممالک کی تعداد دس ہے۔ وہ دس ممالک ہیں: الجیریا، برونئی انڈونیشیا، عراق، کویت، لیبیا، عمان، قطر، سعودی عرب' اور متحدہ عرب امارات ان ملکوں کی کل آبادی ۲۰ کروڑ ۱۳ لاکھ ہے۔ جو اسلامی ممالک کی کل آبادی کا ۳۴ فیصدی ہے۔ اگر انڈونیشیا کو نکال دیا جائے (جس کی اپنی آبادی دس کروڑ ۶۰ لاکھ ہے) تو یہ تناسب گھٹ کر صرف ۸ فیصدی رہ جاتا ہے۔ اس گروہ میں فی کس قومی آمدنی گیارہ ہزار ڈالر سالانہ سے زیادہ ہے۔ انڈونیشیا کو چھوڑ کر اس گروہ کے بقیہ تمام ملکوں میں آبادی بہت کم ہے، اور بیشتر تیل برآمد کرنے والے ممالک میں محنت کشوں کی کمی اور سرمایہ کی زیادتی ہے۔

ب۔ غریب ترین ممالک:۔

اس گروہ میں ۱۸ ممالک شامل ہیں ان کے نام یہ ہیں: افغانستان، بنگلہ دیش، بینن، بورکینا فاسو، چاڈ، کموروس، جیبوتی، گمبیا، گنی بساؤ، گنی، مالدیپ، مالی، نائیجر، سیرالیون، صومالیہ، سوڈان، یوگنڈا اور یمن۔ ان میں بیشتر ممالک افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس گروہ میں اوسط فی کس قومی آمدنی ۲۸۰ امریکی ڈالر سالانہ ہے اس گروہ کے اندر کم سے کم فی کس

قومی آمدنی ۸۰ ڈالر سالانہ (چاڈ) سے لے کر زیادہ سے زیادہ پانچ سو امریکی ڈالر سالانہ تک ہے۔ اس گروہ میں شامل ممالک کی مجموعی آبادی ۲۰ کروڑ ہے جو دنیا بھر کے غریب ممالک کی کل آبادی کا دو تہائی (۶۶ فیصدی) ہے۔ اسلامی ممالک کی ایک تہائی آبادی ان غریب ملکوں میں آباد ہے۔

ج۔ نسبتاً ترقی یافتہ ممالک

بقیہ اسلامی ملکوں کو ایک گروہ میں شامل کیا گیا ہے جسے ہم نسبتاً ترقی یافتہ ممالک کا گروہ کہہ سکتے ہیں۔ اس گروہ میں ۱۵ ممالک شامل ہیں۔ ان ملکوں میں بحرین، کمرون، مصر، گیبون، ایران، اردن، لبنان، ملیشیا، موریطانیہ، مراکش، پاکستان، سینیگال، شام، تونس، اور ترکی شامل ہیں۔ اس گروہ میں فی کس قومی آمدنی بارہ سو امریکی ڈالر ہے۔ ان ملکوں کی مجموعی آبادی ۲۶ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ جو اسلامی ممالک کی کل آبادی کا ۴۱ فیصدی ہے۔

۳۔ اسلامی ممالک میں معاشی ترقی کی سطح

اسلامی ممالک میں معاشی ترقی کی سطح اور اس کی تفریق مندرجہ بالا درجہ بندی ہی سے کسی حد تک ظاہر ہو جاتی ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ رواج کے مطابق تمام اسلامی ملکوں کو ایک عام گروہ قرار دیا جائے جسے "ترقی پذیر ممالک" کہا جاتا ہے لیکن اس طرح کی عمومیت بہت دور تک ہماری رہنمائی نہیں کرتی بلکہ کبھی کبھی تو یہ عمومیت خطرناک حد تک گمراہ کن بھی ہو سکتی ہے۔ ایک ایسا عمومی تصور جس میں چاڈ اور سوڈان جیسے ملکوں کے ساتھ ترکی اور پاکستان کو بھی شامل سمجھا جائے وہ عام طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اسلامی ممالک میں معاشی ترقی کی شرح اور رفتار خاصی تیز ہے، بعض میں صرف اطمینان بخش اور بعض میں مایوس کن اور غیر اطمینان بخش، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ممالک کی معاشی ترقی میں خاصا فرق نمایاں ہے اور ان ملکوں کو درپیش ترقیاتی مسائل کے کسی تجزیہ میں اس فرق کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

مندرجہ بالا امور کے پیشِ نظر، اسلامی ملکوں کی معاشی ترقی کے مندرجہ ذیل تین مختلف طرز اور نمونے (Patterns) پہچانے جا سکتے ہیں:۔

اوّل۔ مغربی ایشیا اور خلیج العربی میں واقع تیل کی دولت پر منحصر معیشتیں جن میں فی کس قومی آمدنی کی سطح اتنی اونچی ہے کہ اس کا موازنہ انتہائی ترقی یافتہ صنعتی ممالک سے کیا جا سکتا ہے۔ ان ممالک نے اپنی معاشی ترقی کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی ہے اس کا انحصار سرمایہ کی کثرت، غیر ملکی محنت کشوں، اور درآمد شدہ ٹکنالوجی پر ہے۔

دوم۔ مغربی افریقہ میں واقع غریب ترین ممالک جن کا انحصار زرعی زمرے پر ہے۔ ان معیشتوں میں تحرک (Dynamism) کا فقدان ہے۔ اس لیے ان کو ٹھہری ہوئی اور زوال پذیر (Stagnant & Declining) معیشتیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ خشک سالی کی شکار ہیں، غذائی اجناس کی شدید قلت ان کی امتیازی خصوصیت ہے اور گذشتہ دس پندرہ برسوں سے ان کو قحط سالی جیسی صورت حال کا سامنا ہے۔

سوم۔ وہ معیشتیں جن میں تسلی بخش صنعتی بنیاد اور بنیادی ڈھانچہ کی سہولتیں فراہم ہیں اور قومی وسائل، اور غیر ملکی مالی و تکنیکی امداد کے بل پر اقتصادی و صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔

ان نمونوں کے پیش نظر اسلامی ممالک میں معاشی ترقی کے مختلف اشاریوں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ ان سے کیا تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے:

(الف) کل قومی پیداوار کی ماہیت۔

گو کہ اسلامی ممالک کی کل قومی پیداوار اور فی کس آمدنی میں افراط و تفریط کے بہت سے نمونے پائے جاتے ہیں لیکن اس کی ماہیت میں حیرت انگیز یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ یکسانیت اس وقت اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب ان ممالک کی مناسب درجہ بندی کر دی جائے۔ اسلامی ممالک میں کل قومی پیداوار کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ قومی پیداوار میں بنیادی زمرے (Primary Sector) کا حصہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔ بنیادی زمرے میں زراعت، شکار بازی، ماہی گیری، جنگلات کان کنی، بجلی، گیس، اور پانی جیسے پیداواری اعمال شامل ہوتے ہیں۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک میں تیل کی تلاش، اور تیل کے کنوؤں سے اس کا اخراج بھی بنیادی زمرے میں شامل مانا جاتا ہے۔

تیل برآمد کرنے والے ممالک میں، کل قومی پیداوار میں بنیادی زمرے کا حصّہ عام طور پر ۴۰ فیصدی سے زائد ہے اور بعض حالتوں میں تو یہ ۵۰ فیصدی تک پہونچ جاتا ہے۔ نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں بھی بنیادی زمرے کا حِصّہ کافی ہے اور اس کی حد ترکی میں ۲۵ فیصدی سے لے کر مصر میں ۴۹ فیصدی تک ہے۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں فطری طور پر بنیادی زمرے کا حِصّہ زیادہ ہے اور ۶۵ سے ۷۰ فیصدی کے درمیان ہے۔ ان ممالک میں یہ حصّہ زراعت کی وجہ سے زیادہ ہے جبکہ تیل برآمدی ممالک میں اس کی وجہ معیشت کا تیل پیدا کرنے والے زمرے پر انحصار ہے۔ ان ممالک میں انڈونیشیا کے استثناء کے ساتھ قومی پیداوار میں زراعت کا حِصّہ تقریباً ناقابلِ لحاظ ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ تقریباً تمام اسلامی ممالک میں، قومی پیداوار میں صنعتی زمرے کا حِصّہ بہت ہی قلیل ہے۔ غیر ترقی یافتہ اسلامی ممالک میں صنعتی زمرہ قومی پیداوار کا صرف پانچ یا سات فیصدی حِصّہ پیدا کرتا ہے۔ الجیریا اور انڈونیشیا کے استثناء کے ساتھ تیل برآمدی ممالک میں یہ تناسب ۹ فیصدی کے لگ بھگ ہے۔ نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں صنعتی زمرہ کا قومی پیداوار میں حصہ تقریباً دس بارہ فیصدی کے درمیان ہے البتہ ملیشیا (۲۰ فیصدی) اور ترکی (۲۵ فیصدی) اس گروہ میں سب سے ممتاز ہیں۔

اسلامی ملکوں میں قومی پیداوار میں زمرۂ خدمات (Services Sector) کا حِصّہ سب سے زیادہ ہے اور اس کا تناسب ۴۰ فیصدی سے ۷۰ فیصدی تک ہے۔ زمرۂ خدمات میں عام طور پر نقل وحمل، مواصلات، تعمیرات، تھوک اور خوردہ فروشی، اور سرکاری یا حکومتی اعمال جیسے عوامی انتظام (Public Administration) عدلیہ، دفاع وغیرہ شمار کی جاتی ہیں۔ چونکہ ہر منضبط معاشرے کو ان اعمال وخدمات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے قومی پیداوار میں اس زمرے کے حِصّہ کے زیادہ ہونے سے معاشی ترقی کی ماہیت پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔

اس کے برعکس، اگر قومی پیداوار کو معاشی افعال کی نوعیت کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو قومی پیداوار کی ماہیت سے معاشی ترقی کے اندرونی تحرک (Internal Dynamics) کا اچھا اندازہ ہوسکتا ہے۔ عام طور پر معاشی اعمال کو نوعیت کے اعتبار سے سات اقسام میں بانٹا جاتا ہے (۱) زراعت بشمول شکار بازی،

ماہی گیری وجنگلات (۲) کان کنی بشمول بجلی، گیس اور پانی کی پیداوار (۳) صنعت (۴) تعمیرات (۵) نقل وحمل اور مواصلات (۶) تھوک اور خوردہ فروشی (۷) دوسری خدمات، جن میں مالی سماجی اور سرکاری خدمات شامل ہیں۔

جب اسلامی ممالک کی کل پیداوار کو ان معاشی اعمال پر تقسیم کرکے دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) انڈونیشیا اور الجیریا کے استثناء کے ساتھ، تیل برآمد کرنے والے ممالک میں، قومی پیداوار میں زراعت کا حصّہ بہت کم ہے۔ ان ملکوں میں عراق، کویت، لیبیا، اومان، قطر، سعودی عرب، اور متحدہ عرب امارات شامل ہیں۔ غریب مسلم ممالک میں، افغانستان، بنگلہ دیش، بنین، برکینا فاسو، چاڈ، نائیجر، سیرالیون، سوڈان اور یوگنڈا میں، قومی پیداوار میں زراعت کا تناسب کافی زیادہ ہے۔ نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں زراعت کا حصّہ ۲۰ سے ۳۰ فیصدی کے درمیان ہے لیکن بحرین، گیبون، اردن اور لبنان اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں جہاں یہ تناسب کم ہے۔

(۲) کان کنی اور اس کے متعلقات کا حصّہ تیل برآمدی ممالک میں کافی زیادہ ہے۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں اس زمرے کا تناسب دس سے پندرہ فیصدی کے درمیان ہے اور نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں اس سے زیادہ ہے۔

(۳) قومی پیداوار میں صنعت کا حصّہ، تیل برآمدی ممالک، اور غیر ترقی یافتہ ممالک دونوں میں کافی کم ہے۔ ان دونوں گروہوں میں یہ تناسب سات سے دس فیصدی کے درمیان ہے۔ نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں صنعت کا قومی پیداوار میں تناسب ان دونوں گروہوں سے زیادہ ہے اور عام طور پر ۱۲ فیصدی تک ہے۔ جن ممالک میں صنعت کا قومی پیداوار میں تناسب ۱۲ فیصدی یا اس سے زیادہ ہے ان میں مصر، اردن، تونس (ہر ایک ۱۲ فیصدی) ملیشیا (۲۰ فیصدی) مراکش (۱۷ فیصدی) اور پاکستان (۱۷ فیصدی) قابل ذکر ہیں۔ ترکی میں یہ تناسب سب سے زیادہ ہے جہاں قومی پیداوار کا ۲۵ فیصدی حصّہ صنعتی زمرے میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی ملکوں میں ترکی وہ ملک ہے جہاں صنعتی ترقی سب سے زیادہ ہوئی ہے۔

(۴) تیل برآمدی ممالک میں قومی پیداوار میں تعمیرات کا حصّہ کافی زیادہ ہے (۱۰ فیصدی

یا اس سے زیادہ) غیر ترقی یافتہ ممالک میں یہ تناسب بہت کم ہے (۳ فیصدی سے ۵ فیصدی) نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں کوئی خاص رجحان نہیں دکھائی دیتا، کہیں یہ تناسب زیادہ ہے کہیں کم۔

(۵) تھوک اور خوردہ فروشی کا تناسب تینوں گروہوں میں خاصا قابلِ لحاظ ہے اور عام طور پر ۱۰ فیصدی سے زیادہ ہے۔ بعض ملکوں میں یہ تناسب ۱۵ بیس فیصدی تک بھی پہونچ جاتا ہے۔ ایسا ان ملکوں میں غیر منظم زمرے کی موجودگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

(۶) قومی پیداوار میں نقل و حمل کا تناسب تینوں گروہوں میں کم ہے۔ یہ کم تناسب اسلامی ممالک کی معاشی اور تکنیکی پس ماندگی کا مظہر ہے۔

(۷) زمرہ خدمات جس میں مالی، سماجی، کاروباری خدمات جس میں مالی، سماجی، کاروباری خدمات شامل ہیں قومی پیداوار کا ۱۵ سے ۲۵ فیصد حصّہ فراہم کرتا ہے۔

(ب) اسلامی ممالک میں برآمدات کی ماہیت۔

ایک کلیہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ممالک زرعی پیداوار کے برآمد کنندہ اور صنعتی پیداوار کے درآمد کنندہ ہیں۔ ان کی غیر ملکی تجارت کا نہج غیر متوازن، اور غیر متناسب ہے۔ بیشتر ممالک کی برآمد کا انحصار صرف چند، اور بسا اوقات صرف ایک تجارتی شے پر ہے۔

اسلامی ممالک میں برآمد کی ماہیت جاننے کے لیے کل برآمدات کو مندرجہ انواع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) غذائی برآمدات (۲) غیر غذائی زرعی برآمدات (۳) ایندھن (۴) معدنیات اور کان کنی اشیاء (۵) صنعتی اشیاء (۶) باقی ماندہ اشیاء اسلامی ممالک کی غیر ملکی تجارت (برآمدات) کے اعداد و شمار کے تجزیہ سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں۔

(۱) تیل برآمدی ممالک کے برآمدات کا انحصار ایک واحد شے یعنی پٹرول کی برآمد پر ہے، زیادہ تر تیل برآمدی ممالک میں تیل کی برآمدات کل برآمدات کا ۹۰ فیصدی ہیں۔ لیبیا میں پٹرول کی برآمدات کل برآمدات کا ۹۹ فیصدی، اور سعودی عرب میں ۹۸ فیصدی ہیں۔

(۲) غیر ترقی یافتہ مسلم ممالک میں بنیادی زمرہ کی پیداوار (یعنی غذائی اور غیر غذائی زرعی پیداوار) کو برآمدات میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ کل برآمدات میں اس

زمرہ کا حصّہ ۷۰ سے ۸۰ فیصد ہے جو کبھی کبھی ۹۰ فیصدی تک بھی پہونچ جاتا ہے۔

(۳) بعض غیر ترقی یافتہ ممالک میں صنعتی برآمدات کا کل برآمدات میں کافی حصّہ ہے۔ لیکن اگر گہرائی سے اس کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد میں زرعی پیداوار چھپی ہوئی ہے۔ مثلاً بنگلہ دیش میں کل برآمدات میں صنعتی برآمدات کا کافی حصّہ ہے۔ (۴۷ فیصدی) لیکن اس کا ۶۵ فیصدی تو جوٹ اور اس سے متعلقہ اشیاء پر مشتمل ہے جو کہ زرعی زمرے کی پیداوار ہے لیکن اقوام متحدہ کے شماریاتی نظام میں اس کو صنعتی پیداوار گنا جاتا ہے۔ یہی بات کموروس، مالی، سیرالیون، اور یمن پر بھی صادق آتی ہے۔

(۴) نسبتاً ترقی یافتہ ممالک کی برآمدات میں زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ ان ملکوں میں بنیادی زمرے کی برآمدات خاصی اہم ہیں لیکن ان کا تناسب اتنا زیادہ نہیں ہے۔ جتنا کہ تیل برآمدی ممالک اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ عام طور پر، بنیادی زمرے کی برآمدات، ان ملکوں کی کل برآمدات کا ۲۰ سے ۴۰ فیصد تک ہیں۔

(۵) اسلامی ممالک میں صنعتی برآمدات کل برآمدات کا ایک بہت ہی حقیر حصّہ ہیں خاص طور پر تیل برآمدی ممالک اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں یہ تناسب بہت ہی کم ہے نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں صورتِ حال کسی قدر بہتر ہے۔

ج۔ اسلامی ممالک میں درآمدات کی نوعیت

اسلامی ممالک عام طور پر تیار شدہ صنعتی اشیاء اور غذائی اشیاء کی درآمد کرتے ہیں۔ زیادہ تر ملکوں میں ان دو اشیاء کی درآمد، کل درآمد کا ۹۰ فیصدی حصّہ ہے۔ اسلامی ممالک کے تینوں گروہوں میں اسی رجحان کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے گو کہ ہر گروہ کے اندر ایک آدھ مستثنیات بھی موجود ہیں۔ مثلاً تیل برآمدی ممالک میں غذائی اشیاء کی درآمد کل درآمد کا ۱۵۔۲۰ فیصدی ہے لیکن غیر ترقی یافتہ اسلامی ممالک میں یہی تناسب ۱۵۔۳۰ فیصدی کے لگ بھگ ہے۔ نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں درآمد کی ماہیت میں زیادہ تنوع پایا جاتا ہے کیونکہ غذائی اور صنعتی اشیاء کے ساتھ ساتھ ایندھن، معدنیات اور مشینری کی درآمد کو بھی ان کی کل درآمدات میں قابل لحاظ پوزیشن حاصل ہے۔ سینگال، ترکی، اور تونس میں کل درآمدات کا ایک تہائی حصّہ ایندھن کی درآمد ہے۔

(د) صنعتی اشیاء میں غیر ملکی تجارت کی نوعیت

بیشتر اسلامی ممالک صنعتی اشیاء کے درآمد کنندگان ہیں اس لیے صنعتی اشیاء میں غیر ملکی تجارت کے مطالعہ سے یہ بات معلوم کی جاسکتی ہے کہ اسلامی ممالک میں کن اشیاء کے لین دین کی اہمیت ہے۔ صنعتی اشیاء کو مندرجہ ذیل انواع میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) غیر دیرپا اشیاء (۲) درمیانی اشیاء (۳) مشینری اور دیرپا اشیاء۔ موجودہ اعداد و شمار کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ:

(۱) اسلامی ممالک میں مشینری، اور دیرپا اشیاء کی برآمد کو کوئی اہم حیثیت حاصل نہیں ہے۔

(۲) غیر دیرپا اشیاء کی برآمد بھی اسلامی ملکوں کے لیے اہم حیثیت کی حامل نہیں ہے۔

(۳) اسلامی ملکوں کی غیر ملکی صنعتی تجارت بیشتر حالتوں میں درمیانی اشیاء پر مشتمل ہے۔

(۴) اسلامی ممالک کی درآمدات میں مشینری اور دیرپا اشیاء کی درآمد کو بھی کوئی خاص پوزیشن حاصل نہیں ہے جو کہ افسوسناک امر ہے کیونکہ اس قسم کی درآمدات سے ہی ملک کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۵) اسلامی ممالک کی برآمدات درمیانی اشیاء، دیرپا اشیائے صرف، اور کسی حد تک مشینری پر مشتمل ہوتی ہیں۔

۳۔ اسلامی ممالک کی تکنیکی پس ماندگی اور انحصار

گذشتہ صفحات میں اسلامی ممالک کی اقتصادی پس ماندگی کے چند پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گو کہ اقتصادی پس ماندگی ایک پیچیدہ عمل ہے اور اس کے مختلف تاریخی، عمرانی، سیاسی اور تکنیکی پہلو ہیں۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ تکنیکی پس ماندگی (Technological Backwardness) ان اسباب میں سے اقتصادی پس ماندگی کا ایک اہم سبب ہے۔

ہم اوپر اس بات کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ اسلامی ممالک عام طور پر زرعی اور بنیادی زمرے کی اشیاء اور خام مال کی برآمد کرتے ہیں اور تیار شدہ صنعتی مصنوعات کی درآمد کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام ترقی پذیر ممالک کی طرح انھیں

بین الاقوامی بازار میں ایک غیر مساوی تجارتی تعلق کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا فائدہ بیشتر صنعتی ممالک کو پہونچتا ہے گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں سے بین الاقوامی بازار میں زرعی اشیاء اور خاص طور پر زرعی خام مال کی قیمتیں برابر گرتی رہی ہیں اور تیار شدہ مصنوعات کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے اس کا انجام یہ ہوا ہے کہ "تجارت کی شرطیں" (Terms of Trade) ترقی پذیر ممالک کے خلاف ہوگئی ہیں۔ اب اتنی ہی رقم حاصل کرنے کے لیے جتنی وہ پہلے حاصل کرتے تھے، ترقی پذیر ممالک کو زیادہ مال بازار میں لانا ہوگا۔ دوسری طرف تکنیکی ترقی کے باعث اس طرح کے خام مال کی مانگ میں بھی کمی ہوتی جارہی ہے۔ مزید براں، تکنیکی ترقی بھی صنعتی ممالک کے مفاد میں ہی کام کرتی نظر آتی ہے۔

صنعتی ممالک کی کامیابی کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ایسی اشیاء کی پیداوار کرتے ہیں جس کو ترقی پذیر ممالک میں آسانی سے فروخت کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ ان کی کامیابی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے بلاشرکتِ غیرے مالک ہیں اور انھوں نے ایسی بین قومی کارپوریشن (Multinational Corpora-tions) قائم کر رکھی ہیں جو صنعتی میدان میں سائنس اور ٹکنالوجی کے اطلاق کو فروغ دیتی رہتی ہیں جس سے صنعتی ممالک میں محنت کشوں کی پیداآوری (Productiv-ity) میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اس طرح وہ مختلف اشیاء نسبتاً کم لاگت پر اچھے معیار اور زیادہ مقدار میں پیدا کرنے کے اہل ہوتے جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان جو تجارتی تعلقات قائم ہوتے ہیں وہ سراسر ترقی یافتہ ممالک کے حق میں جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی ممالک، اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں تکنیکی پس ماندگی کی صورت حال درج ذیل ہے۔

(۱) ان ملکوں میں تکنیکی ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ ہر سال جو پیٹنٹ رجسٹر کرائے جاتے ہیں ان میں ترقی پذیر ممالک کا تناسب کسی طرح قابل ذکر نہیں ہے۔ اور ان میں اسلامی ممالک کا حصہ صفر کے برابر ہے۔

(۲) ترقی پذیر ممالک، ترقی یافتہ ممالک سے ٹکنالوجی درآمد کرتے ہیں جس کے لیے انھیں ترقی یافتہ ممالک کو رائلٹی اور فیس ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس ضمن میں اعداد و شمار کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو ٹکنالوجی کی درآمد کے لیے اپنی برآمدات

سے ہونے والی آمدنی کا ۳ فیصد حصہ رائلٹی اور فیس کی صورت میں ترقی یافتہ ممالک کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

(۳) بین الاقوامی معیشت میں ٹکنالوجی بھی ایک تجارتی شے کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسری تمام اشیاء کی طرح اس کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ۱۹۷۸ء میں ساری دنیا میں ۱۲۰ کروڑ ڈالر لائسنس کی فیس اور رائلٹی کے طور پر دیئے گئے۔ اس میں سے تقریباً ۱۰ فیصدی ترقی پذیر ممالک کے ذریعہ ادا کیا گیا۔ اس میں اسلامی ممالک کا کیا حصہ ہوگا کوئی بھی اس کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ایک امریکن ماہر معاشیات نے ٹکنالوجی وصول کرنے والے ممالک کا مطالعہ کرتے کے لیے جب ۳۳ ترقی پذیر ممالک کا انتخاب کیا تو اس میں صرف ایک اسلامی ملک (مصر) منتخب کیا جا سکا چنانچہ اسلامی ملکوں کی تکنیکی پس ماندگی کی حالت یہ ہے کہ وہ ٹکنالوجی وصول کرنے والے ممالک میں بھی کسی شمار میں نہیں آتے، ٹکنالوجی میں ریسرچ کرنا یا نئی ٹکنالوجی دریافت کرنا تو دور کی بات ہے۔

(۴) مختلف بین اقوامی تجارتی کمپنیوں نے ترقی پذیر ممالک میں تحقیقی و تفتیشی مراکز قائم کر رکھے ہیں جنھیں مرکز برائے تحقیق و ترقی (Research & Developm-ent Centres) کہا جاتا ہے۔ اسلامی ممالک کا اس میں برائے نام بھی حصہ نہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ ان مراکز کی تحقیق بھی ترقی یافتہ ممالک کی اپنی ترجیحات کے مطابق، انھیں کے مفادات کے تابع ہوتی ہے۔

صنعتی ممالک ٹکنالوجی کے پیدا کنندگان کی حیثیت رکھتے ہیں جب کہ ترقی پذیر ممالک ٹکنالوجی کے صارفین ہیں۔ مغربی ممالک میں ٹکنالوجی کی ترقی ایک مسلسل عمل ہے جن کی شرح میں تیزی آتی رہی ہے۔ دوسری جانب اسلامی ممالک کے ان ملکوں پر اقتصادی اور تکنیکی انحصار کے باعث دونوں گروہوں کے درمیان اقتصادی اور تکنیکی فرق میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تیز رفتار صنعتی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برقیاتی صنعت (Electronic Industry) میں پہلے ریڈیو والو استعمال ہوا کرتے تھے لیکن اب چپس Integrated circuits اور Ultra High Chips استعمال ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ایک

چھوٹی سی چپ (Chip) وہی کام کرتی ہے جو دوسری جنگ عظیم سے قبل دس لاکھ ریڈیو والو کرتے تھے۔ قوت (Energy) کے زمرے میں بھی یہی رجحان دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلے حرارت حاصل کرنے کے لیے لکڑی جلائی جاتی تھی۔ موجودہ زمانے میں بیزم سوختنی (جلائی جانے والی لکڑی) کی ترکیب بھی نامانوس معلوم ہوگی۔ پھر کوئلے کا استعمال شروع ہوا۔ پھر اس کی جگہ پٹرول نے لے لی۔ ایسا اندازہ کیا جاتا ہے کہ مسلم ممالک میں سو کروڑ ٹن پٹرول کے ذخائر موجود ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی ممالک اپنی پٹرولیم کی ضروریات کے لیے مشرق وسطیٰ کے ممالک کے دست نگر ہیں، لیکن یہ حقیقت عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتی ہے کہ اوّل تو ان ذخائر کا معاشی اور تکنیکی کنٹرول انھیں مغربی ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرے مغربی ممالک میں اب ایسی ٹکنالوجی وجود میں آچکی ہے جس کے ذریعہ یورینیم کو برقی قوت میں تبدیل کیا جاسکے۔ جب مغربی ممالک ۵۰ ہزار ٹن یورینیم دریافت کرلیں گے تو ان کی برقی قوت پیدا کرنے کی صلاحیت اتنی ہو جائے گی جو ۱۰ کروڑ ٹن پٹرولیم کے مساوی ہو۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی ممالک نائیجر سے خام یورینیم ۲۰ سے ۳۰ ڈالر فی پونڈ کے حساب سے خریدتے ہیں۔ نائیجر کے پاس خام یورینیم کے ذخائر تو ہیں لیکن اس کو استعمال کرنے کی تکنیکی صلاحیت سے وہ محروم ہے۔

۴۔ اسلامی ممالک اور دوہری معیشت

دوہری معیشت (Dual Economy) سے ماہرین معاشیات کی مراد ایک ایسی صورتِ حال سے ہے جس میں ایک قومی معیشت کے اندر دو مختلف اور واضح نظام معیشت پائے جائیں۔ ان میں سے ایک تو معیشت کا جدید زمرہ ہوتا ہے جو باغات (Plantation) کان کنی، تیل صاف کرنے کے کارخانوں (Refine-ries) اور صنعتی کومپلکس (Industrial Complex) وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے بیشتر حالتوں میں اس زمرے کا انتظام و انصرام اور ملکیت بھی غیر ملکی مفادات (بین قومی تجارتی کارپوریشنوں) کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یہ زمرہ اپنی پیداوار بازار کے لیے کرتا ہے۔ تجارتی بنک کاری، ذرائع نقل و حمل، وغیرہ کے جدید نظام اس زمرے کو درکار خدمات

فراہم کرتے ہیں۔ دوسری جانب اسی معیشت میں ایک روایتی زمرہ (Traditi-oanal Sector) ہوتا ہے جو عام طور پر زراعت اور اس سے ملحقہ کاروباری اعمال، چھوٹے پیمانہ کی صنعت، دست کاری، چھوٹے کاروبار پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس زمرے کو درکار خدمات غیر منظم بازاروں کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہیں۔ خاص طور پر مالی بازار اور محنت کا بازار غیر منظم زمرے میں ہوتا ہے۔ یہ زمرہ تجارتی بنک کاری، جدید ذرائع نقل وحمل، مواصلات، وغیرہ سے محروم ہوتا ہے۔ اس زمرے میں تکنیکی تبدیلیاں یا تو سرے سے ہوتی نہیں یا بہت کم ہوتی ہیں، اس زمرے میں پیداوار کا زیادہ تر حصّہ پیدا کنندگان خود استعمال کر لیتے ہیں اور اصل کاری کے لیے کوئی فاضل مقدار نہیں بچتی۔

دوہری معیشت کا ایک تکنیکی پہلو بھی ہے۔ معیشت کے دونوں زمروں میں الگ الگ ٹکنالوجی کا استعمال ہوتا ہے۔ جدید زمرے میں مشینری کا استعمال بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے جبکہ روایتی زمرہ ایسی تکنیکوں پر انحصار کرتا ہے جس میں محنت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ معیشت میں مزدوری کی شرحیں بھی دوہوتی ہیں، جدید زمرہ کار میں عام طور پر مزدوری کی شرح اور دوسری سہولتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ تاہم تاریخی اعتبار سے ترقی پذیر ممالک میں جدید زمرہ کار کی حیثیت ان جزیروں کی جیسی ہے جو پس ماندگی کے سمندر میں موجود ہیں۔ سرمایہ اور کار اندازوں کی کمی، تکنیکی صلاحیت کے فقدان، آمدنی اور دولت کی عدم مساوی تقسیم، اور ایسی ہی کتنی وجوہات کی بنا پر جدید زمرہ کار اس تحریک (Dynamism) سے محروم رہتا ہے کہ وہ پوری معیشت کو جدید طرز پر ڈھال سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں زمرے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں لیکن ان میں کسی طرح کا تعاملی رشتہ (Functional Relationship) قائم نہیں ہو پاتا۔ ان ہی اسباب کی بنا پر مشہور ماہر معاشیات اے۔ کے۔ سین نے کہا تھا "جدید ٹکنالوجی ترقی پذیر ملکوں کی معیشت میں کنول کے پتہ پر شبنم کے قطرہ کی طرح ہے کہ اس کا کہیں اور کوئی نشان نہیں ملتا اور ہمیشہ ڈھلک جانے کے لیے تیار رہتا ہے۔"

اسلامی ملکوں کی معیشتیں دوہری معیشتوں کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ تیل برآمدی ممالک میں تیل تلاش کرنے سے لے کر اس کو صاف کرنے، اور برآمد کرنے کے تمام عوامل پر بین اقوامی تیل کمپنیاں حاوی ہیں۔ گو کہ مختلف (یا شاید تقریباً تمام) تیل برآمدی ممالک میں سیاسی

تبدیلیوں اور وجوہات کی بناء پر تیل کی صنعت کا مالکانہ ڈھانچہ تبدیل ہو گیا ہے۔ بعض جگہ اس صنعت کو قومیا لیا گیا ہے اور جہاں نہیں قومیا یا گیا وہاں تیل کی کمپنیوں کے زیادہ تر حصص قومی ملکیت میں لے لیے گئے ہیں لیکن اس صنعت کی تکنو معاشی ۔ (Technoeco nomic) ماہیت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ تیل کی صنعت میں تلاش (Exploration) اور استخراج (Extraction) سے لے کر صفائی (Refining) تک اعلیٰ درجہ کی سائنٹفک ٹکنالوجی کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ ساری کی ساری ٹکنالوجی تیل برآمدی ممالک کے باہر وضع کی جاتی ہے اور غیر ممالک کے تکنیکی ماہرین اور انجینیر ہی اس پر عمل درآمد کرتے ہیں، تکنو معاشی نقطۂ نظر سے تیل کی صنعت کا، اپنے متعلقہ ملکوں میں معیشت کے باقی ماندہ حصے سے کوئی باہمی ربط و تعلق نہیں ہے۔

مغربی ایشیا میں تو نہ صرف یہ کہ تکنیکی ماہرین، اور انجینیر غیر ملکی ہیں بلکہ محنت کش بھی غیر ممالک سے ہی درآمد کیے جاتے ہیں، گذشتہ دہائی میں تیل کی صنعت نے تیل برآمدی ممالک اور خاص طور پر ان ممالک میں جن کا تعلق "مجلس تعاون خلیج العربی (Gulf - Coopration Council/G.C.C.) سے ہے، غیر ملکی زرمبادلہ کے انبار لگا دینے میں کامیابی حاصل کی جس سے ان ممالک میں معاشی ترقی کی لے بہت تیز ہو گئی۔ ان ملکوں میں محنت کشوں کی فطری کمی تھی جس کے باعث ۱۹۷۰ء کے اوائل سے زیادہ آبادی رکھنے والے عرب اور ایشیائی ممالک سے محنت کش خلیجی ریاستوں کی جانب جانے لگے تھے، یہاں تک کہ ۱۹۸۵ء تک ان ملکوں سے غیر ملکی محنت کشوں کی تعداد چالیس لاکھ تک پہونچ گئی جو ملکی محنت کشوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس طرح تیل برآمدی ممالک "دوہری معیشت" کی ایک کلاسیکی مثال پیش کرتے ہیں۔

افریقہ اور ایشیا کے غریب اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی دوہری معیشتیں ہیں۔ یہ بات اتنی بدیہی ہے کہ اس کے لیے کسی ثبوت کی حاجت نہیں۔ ان ممالک میں جدید صنعتی زمرہ بہت ہی محدود ہے جو صرف قومی راجدھانیوں، چند ساحلی شہروں یا کچھ بڑے شہروں میں پایا جاتا ہے۔ معیشت کا بقیہ حصہ پس ماندگی اور غربت کا ایک سمندر ہے جس میں ترقی کے جزیرے خال خال ہی ملتے ہیں۔

معاشی اور تکنیکی دوہرے پن (Dualism) کا عمل ان ملکوں میں زیادہ

نمایاں ہے جن کو ہم نے نسبتاً ترقی یافتہ ممالک کا نام دیا ہے۔ ان ملکوں میں پاکستان، ترکی، مصر، تونس، اور ایران جیسے ممالک شامل ہیں جنھوں نے صنعتی اور معاشی ترقی کے کچھ مرحلے طے کر لیے ہیں۔ ان ملکوں میں صنعت/زراعت اور دیہی/شہری زندگی کا دو قسما پن (Dichotomy) صومالیہ اور سوڈان جیسے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت جو اپنی غربت اور پس ماندگی میں زیادہ یکساں اور یک رنگے ہیں، زیادہ ممتاز ہے۔ ان ممالک میں روایتی اور جدید زمروں میں نہ صرف تکنیک کا فرق پایا جاتا ہے بلکہ یہ ایک دوسرے سے طرز زندگی، طرز فکر، فلسفۂ زندگی" رجحانات، پسند اور ناپسند میں بھی مختلف ہوتے ہیں، ان ممالک میں اگر معاشی ترقی اور سماجی رجحانات کو ایک معتدل اور متوازن راہ پر ڈالنا مقصود ہو تو شائد یہ زیادہ مشکل کام ثابت ہو۔

۶۔ اسلامی ممالک میں سائنس اور ٹکنالوجی

موجودہ صورتِ حال میں جب کہ درآمد شدہ ٹکنالوجی، اسلامی ممالک کی ضروریات، قومی ترجیحات، اور قدرتی وسائل سے ہم آہنگی کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اور اسلامی ممالک بشمول دیگر ترقی پذیر ممالک، اپنی ضرورت کی ٹکنالوجی خود پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ملکوں کو کیا کرنا چاہیے۔؟ آخر یہ ان تکنیکی ضرورتوں کو کس طرح پورا کریں کہ ان کے معاشی مقاصد (مثلاً اپنے شہریوں کو روزگار کی فراہمی محنت کشوں کی پیداآوری میں اضافہ، فی کس قومی آمدنی میں اضافہ، معاشی ترقی و معاشی نمو کا حصول وغیرہ) حاصل ہو سکیں۔ اس سلسلے میں ترقیاتی معاشیات (Development Economics) کے ماہرین کا خیال ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو اپنی توجہ درمیانی ٹکنالوجی" (Intermedial Technology) یا مناسب ٹکنالوجی (Appropriate Technology) پر مرکوز کرنا چاہیئے یعنی موجودہ تکنیکی طریقوں میں ترقی پذیر ممالک اس اعتبار سے ترمیم و تنسیخ کریں کہ یہ ٹکنالوجی ان کے سماجی و معاشی حالات سے ہم آہنگ ہو جائے، اور اس میں ترقی اور نمو کی صلاحیت بھی ہو۔ لیکن ایسا کر سکنے کے اہل ہونے کے لیے بھی ان ملکوں کو کئی شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ مثلاً ملک میں تعلیم کا فروغ، سائنس کی تعلیم، سائنسدانو تکنیکی ماہرین اور انجینئروں کی تعداد میں اضافہ، سائنسی تحقیق اور ٹکنالوجی کے اطلاق پہ

زور، وغیرہ۔

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اپنی کُل قومی پیداوار کا تقریباً ایک فی صدی، سائنس کی تحقیق اور نئی تکنیکوں کی دریافت پر خرچ کرتے ہیں۔ ایشیاء کے ترقی پذیر ممالک میں یہ تناسب صفر اعشاریہ پانچ فیصد ہے۔ افریقہ کے ترقی پذیر ممالک میں صورتِ حال اور بھی خراب ہے جہاں یہ تناسب صفر اعشاریہ دو فیصد ہے ترقی یافتہ ممالک میں ہر دس ہزار کی آبادی پر ۲۸۵ سائنس داں اور انجینیر ہیں۔ ایشیاء اور افریقہ کے ترقی پذیر ممالک میں یہ اعداد بالترتیب ۱۵۷ اور ۹۵ ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تکنیکی ہنرمندوں (Technicians) کی تعداد کل آبادی کا ۱۱٫۵ فیصدی ہے جبکہ ایشیائی ترقی پذیر ممالک میں یہ تعداد ۱٫۸۲ فیصدی ہے۔

اسلامی ممالک میں ناخواندگی

مندرجہ بالا اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی ممالک میں سائنٹفک انسانی قوت (Scientific Man Power) کی تعداد بہت کم ہوگی۔ سائنٹفک انسانی قوت میں سائنس دانوں، انجینیروں اور تکنیکی ہنرمندوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ گمان اغلب یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں ان کی تعداد، عام ترقی پذیر ممالک کے اوسط سے بھی کم ہونا چاہیے کیونکہ اسلامی ممالک کی صف میں بہت سے غریب اور پسماندہ ممالک بھی شامل ہیں۔

اسلامی ممالک کی تکنیکی، سائنسی، اور اقتصادی پس ماندگی کا ایک بڑا سبب ناخواندگی کی اونچی شرح ہے۔ تیل برآمدی ممالک میں عراق کے ممکنہ استثناء کے ساتھ، متعلقہ ممالک کی تقریباً نصف آبادی ناخواندہ ہے، باوجود اس بات کے کہ ان کی فی کس آمدنی کی شرح دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ اور امیر ترین ممالک سے لگے کھاتی ہے۔ نسبتاً ترقی یافتہ ممالک میں صورتِ حال مخلوط نظر آتی ہے۔ ان میں ایسے ملک بھی ہیں جن میں ناخواندگی کی شرح بہت کم ہے جیسے ترکی (۲۵ فیصدی) اور لبنان (۲۳ فیصدی) اور ایسے ملک بھی جن میں شرح ناخواندگی بہت زیادہ ہے جیسے مصر (۵۵ فیصدی) پاکستان (۶۶ فیصدی) اور سینگال (۸۰ فیصدی)۔ ایشیاء اور افریقہ کے غیر ترقی یافتہ ممالک میں

خواندگی کی صورتِ حال اور بھی زیادہ خراب ہے جہاں ناخواندگی کی شرح ۷۰ سے ۸۰ فیصدی کے درمیان ہے۔ افغانستان، برکینا فاسو، چاڈ، مالی، نائیجر اور یمن وغیرہ ایسے ممالک ہیں جہاں ۱۹۷۰ء کی دہائی میں شرح ناخواندگی ۹۰ فیصدی سے اوپر تھی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہ شرح گھٹ کر ۸۰ فیصدی کے لگ بھگ آگئی۔ اس طرح دس سال کے عرصہ میں شرح ناخواندگی میں ایک فیصدی شرح سے کمی ہوئی۔ کسی بھی حالت میں، یہ صورتِ حال تشفی بخش نہیں کہی جاسکتی۔ اور ان ملکوں میں شرح ناخواندگی، اب بھی ناقابل قبول طور پر اونچی سطح پر ہے۔

مزید برآں ان ممالک میں ناخواندگی کی شرح مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں بہت زیادہ ہے۔ بیشتر پس ماندہ مسلم ممالک میں خواتین کی شرح ناخواندگی ۸۰ فیصدی سے زیادہ ہے لیکن یمن عرب جمہوریہ (۹۸ فیصدی) افغانستان (۹۴ فیصدی) چاڈ (۹۲ فیصدی) اور مالی (۹۱ فیصدی) میں خواتین کی ناخواندگی قابل تشویش ہے۔

کسی بھی ملک کی تعلیمی ترقی میں خواتین کی خواندگی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ پورے خاندان اور آئندہ نسلوں کی تعلیمی ترقی کا انحصار خواتین پر ہی ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک میں خواتین عام طور پر ناخواندہ ہوں تو اس بات کی امید کم رہ جاتی ہے کہ اس ملک کے بچوں میں اسکولی شرح اندراج (School Enrollment Ratio) میں کوئی قابلِ لحاظ اضافہ ہوسکے۔ اس طرح پورے معاشرے کی تعلیمی اور علمی ترقی کے لیے خواتین کی خواندگی اہم حیثیت کی حامل ہے۔

اسکولی شرح اندراج کی کمی

اسلامی ممالک میں، خاص طور پر پس ماندہ اسلامی ممالک میں تعلیمی اور تکنیکی پسماندگی کی ایک اہم وجہ اسکولوں میں کم شرح اندراج ہے۔ یہ شرح اندراج اسکول جانے والے بچوں کی عمر کے تناسب سے نکالی جاتی ہے۔ اسلامی ممالک میں یہ بیس فیصدی سے لے کر ۸۸ فیصدی کے درمیان ہے لیکن اس کا عام رجحان کمی کی طرف ہے۔ یہ کمی خاص طور پر اس وقت کھٹکتی ہے جب یہ نظر میں رکھا جائے کہ تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک میں، اور یہاں تک کہ بہت سے ترقی پذیر ممالک میں متعلقہ عمر کے بچوں کا،

کم سے کم پرائمری تعلیم میں ہو فیصدی شرح اندراج حاصل کیا جا چکا ہے۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلامی ممالک میں بچوں کا شرح اندراج ثانوی تعلیم کی سطح پر گھٹ کر اس سے بھی کم ہو جاتا ہے جو بنیادی تعلیم کی سطح پر تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی تعلیم ختم کرنے کے بعد یا اس سے پہلے ہی طلبا کی شرح اخراج (Drop Out Ratio) میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ثانوی تعلیم کی سطح پر طلبا کا شرح اندراج تشویشناک حد تک کم ہے۔ مزید براں، بنیادی اور ثانوی دونوں سطحوں پر لڑکیوں کا شرح اندراج لڑکوں کے مقابلہ میں کم ہے۔

تعلیم پر کم خرچ

اسلامی ممالک میں عام طور پر تعلیم پر خرچ کا تناسب بہت کم ہے اور یہ ان ممالک کی تعلیمی اور تکنیکی پس ماندگی کا سب سے بڑا سبب ہے جب ہم نے اس ضمن میں اعداد و شمار جمع کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ ۴۵ مسلم ملکوں میں سے ۲۷ ممالک میں اس قسم کے اعداد و شمار جمع نہیں ہو سکے ہیں جس سے اس امر پر کچھ روشنی پڑتی ہو کہ یہ ممالک تعلیم پر کتنا خرچ کرتے ہیں۔ اعداد و شمار کا یہ فقدان بذات خود بڑا فکر انگیز ہے اور ان ممالک کی اقتصادی، تعلیمی اور تکنیکی پس ماندگی کا ایک بڑا مظہر!

عالمی بنک کی عالمی ترقیاتی رپورٹ World Development REport کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق، آٹھ مسلم ممالک ایسے ہیں جو اپنے کل سرکاری اخراجات (Total Government Expenditure) کا دس فیصدی سے کم تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ کل سرکاری اخراجات کا تعلیم پر خرچ ہونے والا حصہ ان ممالک میں حسب ذیل ہے۔ پاکستان ۲ء۲ فیصدی، سوڈان ۱ء۶ فیصدی، انڈونیشیا ۴ء۸ فیصدی، مکوروس ۵ء۷ فیصدی، شام ۱ء۷ فیصدی، اومان ۷ء۷ فیصدی، کویت ۸ء۸ فیصدی اور متحدہ عرب امارات ۵ء۷ فیصدی۔

اسلامی ممالک میں سے ۹ ایسے ملک ہیں جو اپنے کل سرکاری اخراجات کا ۱۰ فیصدی یا اس سے زاید تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ ان میں مالی (۱۰ء۴ فیصدی)، سینگال (۱۵ء۸ فیصدی)، یمن (۱۶ء۴ فیصدی)، مراکش (۱۶ء۲ فیصدی)، ترکی (۱۶ء۸ فیصدی)،

تونس (۱۴۰۲ فیصدی) اردن (۱۰۶۴ فیصدی) ملیشیاء (۱۵۶۹ فیصدی) اور ایران (۱۳۶۶ فیصدی) شامل ہیں۔

عالمی ترقیاتی رپورٹ کو بھی ۲۸ مسلم ممالک کے بارے میں یہ اعداد و شمار فراہم نہیں ہو سکے۔ تاہم موجودہ اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم ممالک میں تعلیم کے لیے مناسب وسائل مختص نہیں کیے جا رہے ہیں اور یہ امر ان سب لوگوں کے لیے تشویش کا باعث ہونا چاہیے جن کو ان ملکوں کی سماجی اور اقتصادی ترقی عزیز ہے، خواندگی کی شرح کی اہمیت نہ صرف سائنسی، تکنیکی اور اقتصادی ترقی کے لیے ہے بلکہ اس سے عام زندگی کی کیفیت سدھارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ایسے اعداد و شمار بھی فراہم نہیں ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ ان وسائل کا کتنا حصّہ سائنسی اور تکنیکی ترقی پر خرچ ہو رہا ہے۔ لیکن قیاس یہی ہے کہ اگر کچھ رقم ان مدوں پر خرچ بھی ہوتی ہے تو وہ ضروریات کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہونا چاہیے۔

یونیورسٹی سطح کی تعلیم

کسی بھی ملک کی سائنسی اور تکنیکی ترقی میں یونیورسٹیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں ایک طرف تو وہ اپنے مختلف مہارت کے شعبوں میں تحقیق اور علم کے فروغ کا کام سرانجام دیتی ہیں تو دوسری جانب وہ سائنس داں، انجینیر، تکنیکی ماہرین، علماء اور فضلاء کی تعلیم و تربیت کرتی ہیں جو دوسرے اداروں میں بھی علم کے فروغ اور تحقیق و تفتیش میں سرگرم رہتے ہیں۔ اس لیے یونیورسٹی سطح کی تعلیم کی حالت سے اس ملک کے علمی اور تحقیقی ماحول کا اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سائنس، ٹکنالوجی اور ترقی کی اسلامی فاؤنڈیشن (IFSTAD (or Islamic Fondation for Science TEchnology &Development کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق مسلم ممالک میں کل ۲۲۲ یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے ۴۰ یونیورسٹیاں پانچ ممالک میں مرتکز ہیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

مصر ۱۳ یونیورسٹیاں

انڈونیشیا	۵۳ یونیورسٹیاں
ایران	۱۸ "
پاکستان	۲۱ "
ترکی	۳۵ "
کل جمع	۱۴۰ "

اسلامی ممالک کی کل آبادی ۶۲ کروڑ ۸۰ لاکھ میں ۲۲۲ یونیورسٹیوں کا مطلب یہ ہے کہ اوسط سے ۲۸ لاکھ لوگوں کے لیے ایک یونیورسٹی ہے۔ مذکورہ بالا پانچ ملکوں میں اسلامی ممالک کی آبادی ۵۹ فیصدی ہے جس میں اسلامی ملکوں کی ۶۳ فیصدی یونیورسٹیاں ہیں، ترکی میں ہر ۱۳ لاکھ لوگوں کے لیے ایک یونیورسٹی ہے جبکہ پاکستان میں ہر ۱۴ لاکھ لوگوں کے لیے ایک یونیورسٹی کا اوسط ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ہر دس لاکھ کی آبادی پر کم سے کم ایک یونیورسٹی ہونا چاہیے تو اسلامی ملکوں میں کم از کم چھ سو یونیورسٹیاں ہونا چاہیے تھیں۔ اس اعتبار سے ان ملکوں میں یونیورسٹیوں کی تعداد، اس تعداد کی ایک تہائی ہے۔ جو ہونا چاہیے۔

مسلم ممالک میں یونیورسٹی تعلیم بھی مختلف مشکلات اور دشواریوں کی شکار ہے۔ بیشتر ممالک میں تربیت یافتہ اور باصلاحیت اساتذہ کا فقدان ہے۔ اساتذہ اور طلباء کا تناسب بہت کم ہے۔ اساتذہ میں ان کی تعداد کم ہے جنھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہو۔ یونیورسٹیوں میں تجربہ گاہوں، سائنسی ساز و سامان اور مالی وسائل کی عام طور پر کمی ہے۔

ان یونیورسٹیوں میں فیکلٹیوں کی کل تعداد ۱۲۱۵ ہے جن میں سے تقریباً نصف کا تعلق ان ۱۰ مضامین سے ہے جن کا تعلق سائنس اور ٹکنالوجی سے ہے۔ ان مضامین میں زراعت، کمپیوٹر سائنس، دندان سازی، انجینیرنگ، صنعتی ٹکنالوجی میڈیکل سائنس، فارمیسی، نیچرل سائنس، علم حیوانات اور منجمنٹ وغیرہ شامل ہیں لیکن کم سے کم گیارہ مسلم ممالک ایسے ہیں جہاں ان میں سے ایک بھی مضمون کی تعلیم کی سہولت نہیں ہے۔ مزید براں کسی مسلم ملک میں اتنی سہولتیں نہیں کہ ان سارے

مضامین کی تعلیم وہاں ہوسکے۔ تاہم مصر، انڈونیشیا، ایران، پاکستان، سعودی عرب، تونس اور ترکی، ان مسلم ممالک میں شامل ہیں جہاں ان میں سے بیشتر مضامین کی تعلیم ہوتی ہے۔

۶۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق

صنعتی اور معاشی ترقی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی بنیادی اہمیت کے پیشِ نظر اسلامی ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ترقیاتی منصوبوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کو مناسب جگہ دیں۔ اب تک ترقی پذیر ممالک، بشمول اسلامی ممالک، اپنی تکنیکی ضروریات کے لیے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں پر منحصر رہے ہیں۔ لیکن اب ان کو اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے اِن کو سائنس اور ٹکنالوجی کی داخلی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔

اس سلسلے میں بعض ترقی پذیر ممالک نے اپنے دروازے بین قومی کمپنیوں کے لیے اس امید پر کھول دیئے ہیں کہ یہ کمپنیاں ان ممالک کو تکنیکی ترقی کرنے میں نہ صرف یہ کہ مدد دیں گی بلکہ ترقی یافتہ ٹکنالوجی کو صنعتی ممالک سے منتقل بھی کریں گی۔ لیکن اب تک کا تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ یہ امیدیں کم ہی بر آتی ہیں۔ بیشتر بین اقوامی کمپنیاں اپنے صنعتی رازوں اور صنعت سے منسلک ٹکنالوجی کو سربمہر رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کا مقصد ترقی پذیر ممالک سے صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان ممالک میں پائی جانے والی سستی محنت (cheap Labour) کے فائدوں سے بہرہ مند ہوں اور ان کے بازاروں پر اپنا قبضہ جمائیں۔ جہاں تک تکنیکی ترقی یا ٹکنالوجی کے انتقال کا سوال ہے، اس میں بھی ان کمپنیوں کا رویہ مشکوک ہی رہا ہے۔ بعض علمی تحقیقاتی مطالعوں کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ کمپنیاں، مقامی وسائل کے دباؤ کے تحت اپنے پیداواری منصوبوں میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتی۔ اگر بہ مشکل تمام کچھ ردّ و بدل کرنے پر یہ مجبور بھی ہوں تو یہ بازار کے حجم (Size) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جہاں تک تکنیکی ترقی کے پھیلاؤ کا تعلق ہے اور اس سلسلے میں بھی بین اقوامی کارپوریشنوں کا کردار محدود افادیت کا حامل ہی رہا ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر بین اقوامی کارپوریشنوں کو بڑے پیمانہ پر خوش آمدید بھی کہا جائے تو بھی مناسب ٹکنالوجی کی دریافت اور اس کے فروغ

میں ان سے کچھ زیادہ مدد ملنے کی توقع نہیں ہے۔ دوسری جانب اگر ٹکنالوجی درآمد کرنے کا راستہ اختیار کیا جائے تو یہ بھی دشواریوں سے خالی نہیں ہے۔ اوّل، تو ہر طرح کی ٹکنالوجی برائے فروخت نہیں ہوتی۔ ترقی یافتہ ممالک میں ٹکنالوجی غیر ممالک کو برآمد کرنے کے خلاف شدید تحفظات اور تعصبات موجود ہیں۔ اس رویہ کے غیر معاشی اور سیاسی اسباب بھی ممکن ہیں لیکن ایک اہم بات یہ ہے کہ درآمد شدہ ٹکنالوجی کے لیے لائیسنس فیس ادا کرنا پڑتی ہے جو ملک کے توازن ادائیگی (Balance of Payment) پر ایک مستقل بار بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ٹکنالوجی درآمد کرنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ درآمد کنندگان کا برآمد کنندگان پر انحصار مستقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کی داخلی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی اگر کوئی خواہش رہی بھی ہو تو وہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ پس لازم ہے کہ ترقی پذیر ممالک بشمول اسلامی ممالک۔ داخلی طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کی صلاحیتیں پروان چڑھانے کے لیے کوشاں ہوں تاکہ وہ اپنی تکنیکی ضروریات میں خود کفیل ہو سکیں۔ وقت پڑنے پر موجودہ ٹکنالوجی میں اپنی معاشرتی اور معاشی ترجیحات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کرنے کے اہل بن سکیں اور تکنیکی بہتری کے ذریعہ محنت کشوں کی پیداآوری میں اضافہ کر سکیں۔

ان سب مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اسلامی ممالک کو اپنے اپنے متعلقہ ممالک کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی پالیسی وضع کرنا ہوگی۔

سائنس اور ٹکنالوجی پالیسی

سائنس اور ٹکنالوجی پالیسی کی نوعیت، مختلف ملکوں کے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر مختلف ہوں گی۔ ایسی پالیسی وضع کرتے وقت جن عوامل کا خاص خیال رکھنا ہوگا ان میں ملک کی معاشی اور صنعتی ترقی کی موجودہ صورتِ حال، قدرتی وسائل، ماحول، موسم، سائنسی قوتِ کار، ملک کی سائنسی اور تعلیمی ترقی وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم بعض عام امور کی جانب اشارہ کرنا یہاں مناسب ہوگا۔

اوّل۔ سائنس اور ٹکنالوجی پالیسی کا نقطۂ نظر طویل مدتی (Long Term) ہونا ضروری ہے۔ سائنسی اور ٹکنالوجی صلاحیتوں کا ارتقا ایک پے چیدہ اور دیرپا عمل

ہے۔ تھوڑی سی مدت میں اس کے نتائج سامنے نہیں آسکتے۔ اس لیے ان پالیسیوں کو ملک کے طویل مدتی معاشی منصوبے سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔

دوم، یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں، صنعت اور حکومت کے درمیان باہمی ہم آہنگی اور تعلق بھی ضروری ہے۔ حکومت ایسے ضابطے بناتی ہے جن کے اندر رہ کر یونیورسٹیاں اور صنعتیں دونوں کام کرتی ہیں۔ دوسری جانب یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے علم میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ جن کا استعمال حکومت اور صنعت دونوں زمروں میں ہوتا ہے۔ ان تمام اداروں کے درمیان باہمی تعاون اور ہم آہنگی تکنیکی ترقی کا باعث ہوگا۔

سوم۔ تکنیکی ترقی کے پھیلاؤ کا مناسب انتظام ہونا چاہیے کہ وہ استعمال کنندگان تک پہونچ سکے۔

چہارم، یونیورسٹیوں اور نجی اور عوامی تحقیقی اداروں کی تحقیق سرگرمیاں ملکی ضروریات کے مطابق ہوجانی چاہیے اور اسی اعتبار سے ان کی تحقیقی ترجیحات کا تعین کیا جانا چاہیے۔

پنجم۔ سائنس اور ٹکنالوجی پالیسی کی بنیاد ملک کی تعلیمی پالیسی پر ہونا چاہیے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی صلاحیتیں ایک غیر تعلیم یافتہ معاشرے میں پیدا کرنا ناممکن ہوگا۔ یہ صلاحیتیں ایک ایسی عمارت کے مشابہ ہوتی ہیں جو اہرام کی طرح ہو یعنی بنیادی تعلیم کی وسیع بنیاد پر ان کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس میں ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، تکنیکی تعلیم اور سائنسی تحقیق مختلف بلاک کی صورتوں میں ہیں۔ جو اپنے حجم میں کم سے کم تر ہوتے جاتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں تعلیمی ڈھانچہ ابھی غیر ترقی یافتہ ہے اس لیے ان کے سامنے ایک عظیم چیلنج ہے۔ اس لیے اپنی تکنیکی پس ماندگی پر قابو پانے کے لیے ان ممالک کو تعلیمی ترقی کا ایک طویل مدتی منصوبہ، ملک کے ترقیاتی منصوبوں میں شامل کرنا ہوگا، ان کو تعلیم کی ترقی کے لیے مزید وسائل مختص کرنا ہوں گے۔ بنیادی اور ثانوی تعلیم کو تیزی سے ترقی دینا ہوگا، تب ہی وہ اس قابل ہوسکیں گے کہ اپنی تکنیکی پس ماندگی پر قابو پاسکیں جو عہد جدید میں اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے بنیادی شرط بن چکی ہے۔